ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1981

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ — شعبہ قرآن وتفسیر

کورس: اسلام اور استشراق (1981)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن وتفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 50

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جواب اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ ہو بہو نقل کرنا تعلیمی دیانت کے خلاف ہے اور یونیورسٹی کی ہدایات کے مطابق مشق کی قدر و قیمت بھی اسی صورت میں برقرار رہتی ہے جب تحریر طالب علم کی اپنی سمجھ کی عکاس ہو۔

طریقہ کار سے متعلق نوٹ: اس گائیڈ میں مستشرقین کے دعوے اور ان پر مسلم اہلِ علم کے جوابات دونوں خالصتاً علمی اور تعلیمی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ جہاں کسی خاص درسی کتاب کی مخصوص تفصیل درکار تھی اور اس کی تصدیق ممکن نہ ہو سکی، وہاں کورس کے معیاری اور معروف علمی مواد کو بنیاد بنایا گیا ہے اور کوئی قول یا واقعہ من گھڑت طور پر کسی مصنف کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ دینی احکام کا کسی شخص یا معاملے پر اطلاق اہلِ علم اور مجاز فورم کا کام ہے؛ یہ گائیڈ صرف تعلیمی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

اسلام اور استشراق (1981) بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر) کا وہ کورس ہے جو طالب علم کو مغربی مطالعہ اسلام کی روایت، اس کی تاریخ اور اس کے بڑے مباحث سے روشناس کراتا ہے، تاکہ وہ جدید تحقیقی ادب کو مرعوبیت کے بغیر پڑھ سکے اور اس کا جواب علمی اصولوں کے ساتھ دے سکے۔ امتحانی مشق نمبر 1 یونٹ 1 تا 5 پر مشتمل ہے اور اس کے چار سوالات اس کورس کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ پہلا سوال استشراق کے لغوی و اصطلاحی مفہوم اور اس کے ارتقاء سے متعلق ہے، دوسرا سوال ان اسرائیلیات کی نشاندہی مانگتا ہے جنہیں منفی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، تیسرا سوال علوم القرآن پر اعتراضات کا تنقیدی جائزہ چاہتا ہے، اور چوتھا سوال صحابہ کرام سے منسوب مصاحف کے استعمال کے مقاصد پر مقالہ طلب کرتا ہے۔ چاروں سوالوں میں ایک فکری تسلسل ہے: پہلے روایت کو پہچانو، پھر مأخذ کا درجہ جانو، پھر اعتراض کو پرکھو، اور آخر میں مقالے کی صورت میں اپنا منظم موقف پیش کرو۔ اس گائیڈ میں ہر جواب تعارف، ذیلی عناوین اور نتیجے کے ساتھ دیا گیا ہے، جہاں مناسب ہوا جدول اور شکل سے بھی وضاحت کی گئی ہے۔ طالب علم ان جوابات کو سمجھ کر اپنے الفاظ میں لکھے تو یہی اس گائیڈ کا مقصد پورا ہو گا، کیونکہ استشراق جیسے موضوع پر اپنی سمجھ سے لکھنا ہی اصل امتحان ہے۔

سوال نمبر 1 (25 نمبر)

سوال: استشراق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور ارتقاء علمی انداز میں تحریر کریں۔

تعارف

استشراق مغربی اہلِ علم کی اس وسیع فکری اور تحقیقی سرگرمی کا نام ہے جس کے ذریعے مشرق، بالخصوص اسلامی دنیا، کی زبانوں، مذاہب، تاریخ، تہذیب اور ادب کا مطالعہ کیا گیا۔ یہ مطالعہ محض کتابی دلچسپی تک محدود نہیں رہا بلکہ مختلف ادوار میں اس کے پس منظر میں مذہبی مناظرہ، تجارتی مفادات، سفارتی ضروریات اور نو آبادیاتی سیاست بھی کارفرما رہی، اسی لیے اس کا جائزہ لیتے وقت اس کے متنوع محرکات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ بی ایس علوم اسلامیہ کے طالب علم کے لیے استشراق کا مفہوم اور اس کا تاریخی ارتقاء

سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ قرآن، حدیث، سیرت اور فقہ پر جدید مغربی تحقیق کا بڑا حصہ اسی روایت سے نکلتا ہے، اور اس تحقیق سے واقفیت کے بغیر نہ اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کمزوریوں کا علمی جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس جواب میں پہلے لفظِ استشراق کا لغوی تجزیہ کیا جائے گا، پھر اس کی اصطلاحی تعریفیں اور ان کا تنقیدی موازنہ پیش کیا جائے گا، اور آخر میں اس تحریک کے ارتقاء کو بڑے تاریخی مراحل میں تقسیم کر کے بیان کیا جائے گا، تاکہ تصویر مکمل اور منظم صورت میں سامنے آئے۔

استشراق کا لغوی مفہوم

لفظِ استشراق عربی زبان کے لفظ شرق سے ماخوذ ہے جس کے معنی سورج کے طلوع ہونے کی جگہ یعنی مشرق کے ہیں۔ عربی صرف کے قاعدے کے مطابق یہ بابِ استفعال کا مصدر ہے اور اس باب کی خاصیت طلب اور چاہت کا مفہوم پیدا کرنا ہے، چنانچہ استشراق کے لغوی معنی ہوئے مشرق کو طلب کرنا، مشرق کی طرف متوجہ ہونا یا مشرق سے متعلق علوم حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اسی مادے سے مستشرق کی اصطلاح بنی جس سے مراد وہ مغربی عالم ہے جو مشرقی زبانوں اور علوم کا مطالعہ کرے۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ Orientalism اور عالم کے لیے Orientalist استعمال ہوتا ہے جو لاطینی لفظ Oriens سے نکلا ہے جس کے معنی بھی طلوعِ آفتاب اور مشرق ہی کے ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مشرق و مغرب کی یہ تقسیم جغرافیائی سے زیادہ تہذیبی اور سیاسی اصطلاح کے طور پر پروان چڑھی؛ یورپ کے اہلِ علم نے اپنے مقابل خطے کو ایک وحدت کے طور پر دیکھا حالانکہ مشرق خود کئی تہذیبوں، زبانوں اور مذاہب کا مجموعہ ہے۔ لغوی مفہوم اپنی جگہ سادہ ہے لیکن اصطلاحی سطح پر یہ لفظ ایک پوری علمی روایت، اس کے اداروں اور اس کے مقاصد کا عنوان بن گیا، اسی لیے تعریف میں داخل ہوتے وقت لغوی معنی سے آگے بڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

استشراق کا اصطلاحی مفہوم اور اہم تعریفیں

اصطلاحی طور پر استشراق سے مراد مغربی اہلِ علم کا مشرق، خصوصاً عالمِ اسلام، کی زبانوں، مذاہب، تاریخ، قوانین، ادب اور تہذیبی ورثے کا منظم مطالعہ ہے، خواہ اس کا مقصد خالص علمی تحقیق ہو یا اس کے پس منظر میں کوئی اور غرض بھی شامل ہو۔ مختلف اہلِ علم نے اس کی تعریف اپنے زاویہ نگاہ سے کی ہے۔ کلاسیکی مغربی روایت میں مستشرق اس

عالم کو کہا جاتا تھا جو عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت یا چینی جیسی مشرقی زبانوں میں مہارت رکھتا ہو اور ان کے ادب و تاریخ پر تحقیق کرتا ہو۔ اس تعریف میں زبان دانی اور مخطوطات کی تدوین مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف بعض مسلم مفکرین نے استشراق کی تعریف اس کے مقاصد کے اعتبار سے کی اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے مطالعے کی اس مغربی روایت سے تعبیر کیا جس کا مقصد اکثر اوقات علمی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سیاسی بھی رہا۔ فلسطینی نژاد امریکی مفکر ایڈورڈ سعید نے اپنی معروف کتاب Orientalism (1978ء) میں اس اصطلاح کو ایک نئی سطح سے جوڑ دیا۔ ان کے نزدیک استشراق محض مطالعے کا نام نہیں بلکہ مشرق کے بارے میں مغرب کا ایک خاص اندازِ فکر اور اس سے وابستہ ادارہ جاتی ڈھانچا ہے جس کے ذریعے مشرق کو پیش کیا اور بسا اوقات اس پر بالادستی کا جواز بھی فراہم کیا گیا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ایڈورڈ سعید کی رائے ایک تنقیدی نقطہ نظر ہے جس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے اور اس کی تائید بھی، لیکن اس نے استشراق کی بحث کو لسانی تحقیق سے نکال کر طاقت اور علم کے باہمی تعلق کے سوال سے ضرور جوڑ دیا۔ ان تعریفوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استشراق ایک ہمہ جہت مظہر ہے: اس میں مخلصانہ علمی تحقیق بھی ہے، مخطوطات کی تدوین اور لسانی خدمات بھی، اور ساتھ ہی ایسے رجحانات بھی جن پر تعصب اور غرض مندی کا الزام علمی بنیادوں پر لگایا گیا ہے۔ لہٰذا درست علمی رویہ یہ ہے کہ استشراق کو نہ کلیتاً رد کیا جائے اور نہ آنکھ بند کر کے قبول کیا جائے، بلکہ ہر تحقیق کا جائزہ اس کے دلائل اور مآخذ کی بنیاد پر لیا جائے۔

جدول 1: استشراق کی تعریف کے تین زاویے

زاویہ	تعریف کا محور	مثال / نمائندگی
لسانی و علمی	مشرقی زبانوں اور مخطوطات کا مطالعہ و تدوین	کلاسیکی مستشرقین، لغات و فہارس کی تیاری
مقصدی و تاریخی	مذہبی، تجارتی اور سیاسی مقاصد سے جڑا مطالعہ	مناظراتی ادب، نوآبادیاتی دور کی تحقیقات
تنقیدی و تہذیبی	علم اور طاقت کے تعلق کے تناظر میں مطالعہ	ایڈورڈ سعید کا تنقیدی نقطہ نظر

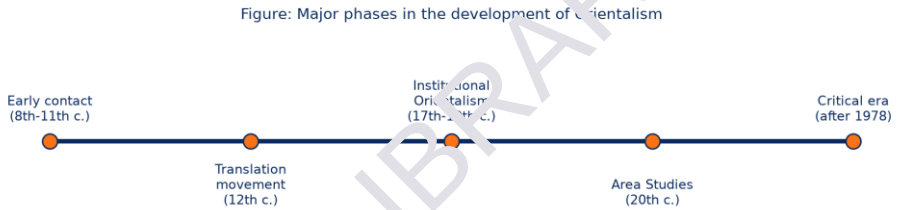
استشراق کا ارتقاء: ابتدائی ادوار

استشراق کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے اسے بڑے مراحل میں تقسیم کرنا مفید ہے۔ پہلا مرحلہ ابتدائی آشنائی اور مخالفت کا ہے۔ اسلام کے ظہور کے بعد جب مسلمانوں کی سیاسی قوت اندلس اور بحیرہ روم کے خطوں تک پھیلی تو یورپ کا اسلام سے براہِ راست واسطہ پڑا۔ اس دور میں اسلام کے بارے میں یورپی معلومات زیادہ تر سنی سنائی باتوں اور مناظراتی تحریروں پر مبنی تھیں اور علمی تحقیق کی بجائے مذہبی رد و قدح غالب تھا۔ اہم قدم ترجمے کی تحریک تھی: بارہویں صدی میں اندلس کے شہر طلیطلہ (Toledo) کو ترجمے کا مرکز بنایا گیا جہاں عربی کتب لاطینی میں منتقل ہوئیں اور اسی دور میں قرآن مجید کا پہلا لاطینی ترجمہ بھی تیار ہوا۔ اس ترجمے کا مقصد اگرچہ بڑی حد تک مناظراتی تھا، لیکن اس کے نتیجے میں یورپ کو عربی زبان اور اسلامی علوم سے براہِ راست واقفیت کا راستہ ملا۔ اسی زمانے میں بعض اہلِ علم نے عربی سیکھنے کی باقاعدہ وکالت بھی کی تاکہ مشرق کو اس کی اپنی زبان میں سمجھا جا سکے۔ تیسرا مرحلہ صلیبی جنگوں اور اس کے بعد کی سفارتی و تجارتی سرگرمیوں سے جڑا ہے جس نے مشرق کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا مگر ساتھ ہی دشمنی کا تاثر بھی گہرا ہوا۔ ان ابتدائی ادوار کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ مطالعہ مقصد کے تابع تھا؛ خالص علمی جستجو ابھی اس رویے کا مرکزی وصف نہیں بنی تھی۔ پھر بھی انہی ادوار میں وہ لسانی بنیادیں پڑ گئیں جن پر آگے چل کر باقاعدہ استشراق کی عمارت کھڑی ہوئی، اس لیے ارتقاء کی کہانی میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

ادارہ جاتی استشراق اور نو آبادیاتی دور

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں استشراق نے ادارہ جاتی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ یورپی جامعات میں عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی کرسیاں قائم ہوئیں، مخطوطات جمع کرنے کا سلسلہ منظم ہوا اور لغات و قواعد کی کتب تیار ہونے لگیں۔ انیسویں صدی میں یہ روایت اپنے عروج کو پہنچی: علمی سوسائٹیاں بنیں، تحقیقی مجلے نکلے، مخطوطات کی فہارس شائع ہوئیں اور بڑے بڑے انسائیکلوپیڈیا اور تراجم کے منصوبے شروع ہوئے۔ اسی دور میں یورپی نو آبادیاتی توسیع اور استشراق کے درمیان گہرا تعلق بھی قائم ہوا، کیونکہ مقبوضہ خطوں کے نظم و نسق کے لیے ان کی زبانوں، قوانین اور رسوم کی معلومات درکار تھیں اور یہ معلومات بڑی حد تک مستشرقین نے فراہم کیں۔ یہیں سے وہ بحث جنم لیتی ہے کہ علم اور اقتدار کا یہ ساتھ استشراق کی غیر جانبداری پر سوال اٹھاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی دور کے مستشرقین نے اسلامی مخطوطات کی تدوین،

نایاب کتب کی اشاعت اور تاریخی مواد کی حفاظت میں ایسی خدمات انجام دیں جن سے بعد میں مسلم محققین نے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ اس دور کا متوازن جائزہ یہی ہے کہ اس میں علمی کارنامے اور سیاسی مقاصد ساتھ ساتھ چلتے رہے اور ہر مستشرق اور ہر کتاب کا معاملہ اس کے اپنے متن اور پس منظر سے پرکھا جانا چاہیے، کسی ایک حکم کو پوری روایت پر لاگو کرنا علمی انصاف نہیں ہے۔



شکل 1: استشراق کے ارتقاء کے بڑے مراحل — ابتدائی آشنائی سے عصری علمی مطالعات تک۔

بیسویں صدی اور عصری صورت حال

بیسویں صدی میں استشراق کی شکل نمایاں طور پر بدلی۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کلاسیکی استشراق کی جگہ علاقائی مطالعات (Area Studies) نے لینا شروع کی جن میں تاریخ اور لسانیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات، معاشیات، سماجیات اور بشریات بھی شامل ہو گئیں۔ امریکہ اور یورپ کی جامعات میں مشرقِ وسطیٰ اور مطالعہ اسلام کے مراکز قائم ہوئے اور تحقیق کے موضوعات میں جدید ریاستیں، تحریکیں اور سماجی تبدیلیاں آ گئیں۔ اس صدی میں دو رجحان بیک وقت نظر آتے ہیں: ایک طرف قرآن، حدیث اور سیرت پر تنقیدی اسلوب کی ایسی تحقیقات سامنے آئیں جن پر مسلم اہلِ علم نے سنجیدہ علمی اعتراضات کیے اور ان کے مفصل جوابات بھی لکھے گئے، اور دوسری طرف ایسے مغربی اہلِ علم بھی سامنے آئے جنہوں نے نسبتاً متوازن اور ہمدردانہ انداز اختیار کیا اور جن کی تحریروں کو مسلمان قارئین نے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب کے بعد خود مغرب کے اندر استشراقی روایت پر تنقید کا سلسلہ تیز ہوا اور مطالعہ مشرق میں مقامیت، نمائندگی اور تعصب جیسے سوالات مرکزی بن گئے۔ اکیسویں صدی میں ڈیجیٹل مخطوطات، بڑے متنی ذخیرے اور بین الشعبہ جاتی طریقے تحقیق کا حصہ بن چکے ہیں اور مسلم دنیا کے اہلِ علم بھی عالمی جامعات میں بیٹھ کر اس بحث میں براہِ راست شریک

ہیں۔اس صورت حال میں طالب علم کے لیے درست رویہ یہ ہے کہ وہ استشراقی تحقیق کو ایک زندہ علمی میدان سمجھ کر پڑھے، اس کے طریقہ کار سے واقف ہو، اس کے دعوؤں کو مآخذ کی کسوٹی پر پرکھے اور جہاں اختلاف ہو وہاں جذبات کی بجائے دلیل سے جواب دے۔

جدول 2: استشراق کے ارتقائی مراحل کا خلاصہ

مرحلہ	تقریبی دور	نمایاں خصوصیت
ابتدائی آشنائی	آٹھویں تا گیارہویں صدی	سنی سنائی معلومات، مناظراتی لہجہ
ترجمے کی تحریک	بارہویں صدی کے بعد	طلیطلہ میں عربی سے لاطینی تراجم
ادارہ جاتی استشراق	سترہویں تا انیسویں صدی	جامعاتی کرسیاں، سوسائٹیاں، مخطوطات کی تدوین
علاقائی مطالعات	بیسویں صدی	سماجی علوم کا امتزاج، مراکزِ تحقیق
تنقیدی و عصری دور	1978ء کے بعد	ایڈورڈ سعید کے بعد خود احتسابی اور نئے طریقے

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ استشراق لفظاً مشرق کی طلب اور مطالعے کا نام ہے اور اصطلاحاً یہ مغربی اہلِ علم کی اس منظم روایت کو کہتے ہیں جس میں مشرق، بالخصوص اسلام، کی زبانوں، مذاہب اور تہذیب کا مطالعہ کیا گیا۔اس کے ارتقاء کی رفتار کسی ایک مقصد سے نہیں سمجھی جا سکتی؛ ابتدائی مناظراتی دور سے ترجمے کی تحریک، ادارہ جاتی تحقیق اور نو آبادیاتی دور سے گزر کر یہ علاقائی مطالعات اور تنقیدی خود جائزے کے مرحلے تک پہنچا ہے۔ ہر مرحلے میں اس کے محرکات ملے جلے رہے ہیں: کہیں مذہبی جوش، کہیں سیاسی ضرورت اور کہیں خالص علمی جستجو۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اس روایت کو تاریخ کے تناظر میں سمجھا جائے، اس کی علمی خدمات کو تسلیم کیا جائے، اس کے متنازع دعوؤں کا جواب

مآخذ اور دلیل سے دیا جائے اور اپنی تحقیق میں وہ معیار قائم کیا جائے جس کی توقع ہم دوسروں سے رکھتے ہیں۔ یہی متوازن رویہ اس کورس کی اصل روح ہے اور آئندہ سوالات میں قرآن، اسرائیلیات، مصاحف اور سیرت پر بحث اسی بنیاد پر آگے بڑھے گی۔

سوال نمبر 2 (25 نمبر)

سوال: بعض اسرائیلیات کی نشاندہی کیجئے جن کو مستشرقین نے منفی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

تعارف

اسرائیلیات سے مراد وہ روایات ہیں جو یہود و نصاریٰ کے علمی و مذہبی ورثے سے مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں خصوصاً تفسیر اور تاریخ میں داخل ہوئیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات اور اہلِ کتاب کے ہاں رائج قصص کی تفصیلات کا ایک حصہ ابتدائی دور کے بعض راویوں کے ذریعے نقل ہوا اور کچھ تفسیری و تاریخی کتب میں جگہ پا گیا۔ مسلم اہلِ علم نے شروع ہی سے ان روایات کے بارے میں محتاط اصول وضع کیے اور انہیں جانچنے کے معیار بھی بیان کیے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب بعض مستشرقین نے ان روایات میں سے کمزور، غیر مصدقہ بلکہ قرآن و سنت سے ٹکرانے والی روایات کو منتخب کر کے انہیں اسلام کی اصل تعلیم کے طور پر پیش کیا اور یوں منفی نتائج اخذ کیے۔ اس جواب میں پہلے اسرائیلیات کا مفہوم اور مسلم علماء کی درجہ بندی بیان کی جائے گی، پھر ان مخصوص قسم کی اسرائیلی روایات کی نشاندہی کی جائے گی جنہیں منفی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، اور آخر میں اس استعمال کے مقاصد اور اس کے علمی جواب کا جائزہ لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہاں مقصد کسی فرد یا گروہ کے بارے میں حکم لگانا نہیں بلکہ ایک علمی مظہر کا تعلیمی تجزیہ ہے۔

اسرائیلیات کا مفہوم اور مسلم علماء کی درجہ بندی

لفظ اسرائیلیات اسرائیل کی طرف نسبت سے بنا ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد وہ اخبار و قصص ہیں جو یہودی (اور وسیع تر مفہوم میں اہلِ کتاب کے) مآخذ سے اسلامی کتابوں میں آئے۔ ان کے داخل ہونے کے اسباب تاریخی ہیں: عرب میں اہلِ کتاب کی بستیاں موجود تھیں، بعض اہلِ کتاب اسلام قبول کر کے آئے اور اپنے سابقہ علم کے ساتھ آئے، اور مبہم قرآنی اشارات کی تفصیل جاننے کی انسانی خواہش نے بھی ان قصص کی طرف رجوع بڑھایا۔ حافظ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں ان روایات کو تین قسموں میں تقسیم کر کے ایک مشہور اصول دیا: پہلی وہ روایات جن کی صداقت قرآن و سنت سے ثابت ہو، وہ قابلِ قبول ہیں؛ دوسری وہ جن کا جھوٹ ہونا ثابت ہو، وہ مردود ہیں؛ تیسری وہ جن کے بارے میں شریعت خاموش ہو، نہ ان کی تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب اور انہیں روایت کرنے کی گنجائش کے ساتھ ان پر اعتقاد نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح محدثین نے سند کی جانچ کے سخت اصولوں سے اس ذخیرے کو مسلسل پرکھا اور جو روایات اصولوں پر پوری نہ اتریں انہیں ضعیف یا موضوع قرار دیا۔ اس پس منظر سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اسرائیلیات اسلامی عقیدے کا مأخذ نہیں ہیں، اور دوسری یہ کہ مسلم علمی روایت خود ان کی چھان بین کی سب سے بڑی نظام رکھتی ہے۔ انہی دو باتوں کو نظر انداز کر کے وہ منفی استعمال ممکن ہوا جس کا جائزہ آگے لیا جا رہا ہے۔

نشاندہی: وہ اسرائیلی روایات جنہیں منفی طور پر استعمال کیا گیا

پہلی قسم انبیائے کرام سے متعلق بعض اسرائیلی قصص ہیں جن میں انبیاء کی عصمت سے ٹکرانے والی تفصیلات ملتی ہیں۔ بعض تفاسیر میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں ایسی اسرائیلی روایات درج ہو گئیں جن کا متن قرآن کے بیان کردہ انبیاء کے مقام سے میل نہیں کھاتا اور جنہیں خود مسلم محققین نے ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ مستشرقین نے انہی روایات کو منتخب کر کے دعویٰ کیا کہ اسلامی تصورِ نبوت میں یہی مواد شامل ہے، حالانکہ یہ مواد اسلام کا عقیدہ نہیں بلکہ وہ روایتی زائد مواد ہے جسے مسلم علماء نے رد کیا ہے۔ دوسری قسم قصصِ آدم و ابتدائے کائنات سے متعلق تفصیلات ہیں جن میں ایامِ تخلیق، جنت کے مقامات اور اس نوع کی جزئیات اسرائیلی مآخذ سے آئیں۔ انہیں بنیاد بنا کر بعض نے قرآنی قصص کو یہودی قصص سے ماخوذ قرار دینے کی کوشش کی، حالانکہ اشتراکِ موضوع اور اخذ میں زمین آسمان کا فرق ہے اور خود مسلم علماء

نے ان جزئیات کو کبھی قرآن کا حصہ قرار نہیں دیا۔ تیسری قسم تاریخی و جغرافیائی تفصیلات ہیں، مثلاً بعض شخصیات کے ناموں، مقامات اور تعدادوں کے بارے میں وہ اضافے جو تفسیر میں اہلِ کتاب سے نقل ہوئے۔ ان اضافوں کو سامنے رکھ کر بعض تحقیقات میں یہ تاثر دیا گیا کہ قرآن کے مبہم اشارات کی اصل یہی قصے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے خود اپنا اسلوب رکھا ہے اور ان تفصیلات کو مفسرین نے حاشیے کے طور پر درج کیا، متن کے طور پر نہیں۔

جدول 1: اسرائیلی روایات کی اقسام اور ان کا منفی استعمال

قسم	مثال کی نوعیت	منفی استعمال کی صورت
انبیاء سے متعلق قصص	عصمت سے ٹکرانے والی تفصیلات	انہیں اسلام کا عقیدہ ظاہر کرنا
قصصِ تخلیق و آدم	ایام و مقامات کی جزئیات	قرآنی قصص کو ماخوذ قرار دینا
تاریخی و جغرافیائی اضافے	نام، مقام اور تعداد کی تفصیل	مبہم اشارات کی اصل انہی قصوں کو کہنا
سمعی و علامتی روایات	غیر مصدقہ علامتی قصے	اسلامی آخرت شناسی پر اعتراضات

چوتھی قسم وہ روایات ہیں جن کا تعلق سابقہ امتوں کے انبیاء اور صالحین کے طویل قصص سے ہے جن کی تفصیل قرآن نے قصداً بیان نہیں کی۔ جہاں قرآن اختصار کرتا ہے وہاں بعض پرانی تفاسیر نے اسرائیلی مواد سے خلا پر کرنے کی کوشش کی۔ مستشرقین نے اس خلا پر کرنے والے مواد کو قرآن کے متن سے جوڑ کر اس پر وہ اعتراضات کیے جو دراصل قرآن پر نہیں بلکہ ان زائد روایات پر ہوتے، اور ساتھ یہ تاثر دیا کہ مسلمان ان سب کو یکساں طور پر مانتے ہیں۔ پانچویں قابلِ ذکر قسم بعض ایسی علامتی اور غیر سندی روایات ہیں جن میں آخرت، فرشتوں یا غیبی امور کی ایسی تشریحات ملتی ہیں جن کا ثبوت مستند مآخذ سے نہیں ملتا۔ ان کو منتخب کر کے بعض تحریروں میں اسلامی آخرت شناسی کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا۔ یہاں یہ نکتہ بار بار دہرانے کے لائق ہے کہ نشاندہی کا مقصد ان روایات کو دہرانا نہیں بلکہ طالب علم کو سکھانا ہے کہ تنقیدی مطالعے میں پہلا سوال

ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات کس درجے کے مأخذ سے آئی ہے۔ جس روایت کو خود مسلم محدثین و مفسرین نے اصولوں کی کسوٹی پر رد کر دیا ہو، اسے اسلام کے خلاف دلیل بنانا علمی دیانت کے خلاف ہے، اور اسی بنیادی نکتے پر مسلم اہلِ علم نے ان تحقیقات کا جواب دیا ہے۔

منفی مقاصد اور ان کا علمی جائزہ

ان روایات کے انتخابی استعمال کے پیچھے عام طور پر تین مقاصد بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا مقصد ماخذیت کا دعویٰ ہے، یعنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ قرآنی قصص یہودی و مسیحی روایات سے لیے گئے ہیں۔ اس دعوے کی کمزوری یہ ہے کہ موضوعات کا اشتراک اخذ کی دلیل نہیں ہوتا، خاص طور پر جب قرآن بار بار سابقہ کتب کی تصدیق اور ان پر نگرانی کا اعلان کرتا ہے اور جہاں اختلاف آتا ہے وہاں سابقہ روایات کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ دوسرا مقصد انبیاء اور مقدس شخصیات کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدے کو کمزور دکھانا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عصمتِ انبیاء کا عقیدہ قرآن کے واضح بیانات پر قائم ہے اور اسرائیلی قصص اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تیسرا مقصد تفسیر کی پوری روایت کو مشکوک قرار دینا ہے، حالانکہ تفسیر کی روایت خود تنقیدی اصولوں پر قائم ہے اور اسرائیلی مواد کی درجہ بندی اسی روایت کے اندر موجود ہے۔ مسلم جوابی ادب نے اس مسئلے کو دو سطحوں پر حل کیا: اصول کی سطح پر ابنِ کثیر اور دیگر محققین کی درجہ بندی کو سامنے رکھا گیا، اور اطلاق کی سطح پر ہر روایت کو الگ الگ پرکھ کر دکھایا گیا کہ کس روایت کا درجہ کیا ہے۔ جدید دور میں بھی اس موضوع پر لکھی گئی کتب میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے سند و متن کا جائزہ لیا جائے، پھر اس پر بننے والے دعوے کا۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ کسی بھی دعوے کو قبول یا رد کرنے سے پہلے اس کا مأخذ تلاش کرے، درجہ معلوم کرے اور پھر رائے قائم کرے؛ یہی اسلوب سیرت اور فقہ کے مباحث میں بھی کام آئے گا جن پر اگلی مشق میں بحث آئے گی۔

نتیجہ

حاصلِ بحث یہ ہے کہ اسرائیلیات اسلامی مآخذ کا اصل حصہ نہیں بلکہ ایک روایتی زائد ذخیرہ ہے جس کے بارے میں مسلم علماء نے واضح اصول اور درجہ بندی دی ہے۔ جن روایات کو مستشرقین نے منفی مقاصد کے لیے استعمال کیا، ان کی اکثریت کا تعلق اسی زائد اور غیر مصدقہ حصے سے ہے: انبیاء سے متعلق ناقابلِ قبول قصے، تخلیق و آدم کی

جزئیات، تاریخی اضافے اور علامتی روایات۔ ان کا انتخابی استعمال اس لیے نادرست ہے کہ وہ مسلم علمی روایت کے اپنے طے کردہ معیارات کو چھوڑ کر سب سے کمزور مواد کو نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ درست علمی جواب الزام کا جواب الزام سے دینا نہیں بلکہ اصولوں کو واضح کرنا اور ہر روایت کو اس کے درجے پر رکھ کر دکھانا ہے۔ اگر طالب علم یہ اصول ذہن میں رکھے تو وہ نہ صرف اس سوال کا جواب بہتر لکھ سکے گا بلکہ علوم القرآن، قراءات اور سیرت کے آئندہ مباحث میں بھی اسی تنقیدی شعور سے کام لے سکے گا۔ یہی اس یونٹ کا اصل حاصل ہے۔

سوال نمبر 3 (25 نمبر)

سوال: علوم القرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

تعارف

علوم القرآن سے مراد وہ علوم ہیں جو قرآن مجید کے نزول، جمع و تدوین، رسم و قراءات، ناسخ و منسوخ، مکی و مدنی اور اسباب نزول جیسے مباحث کو موضوع بناتے ہیں۔ یہ علوم مسلمانوں نے قرآن کی حفاظت اور فہم کے لیے مدون کیے اور ان کی ایک طویل علمی روایت موجود ہے جس میں الزرکشی اور السیوطی جیسے ائمہ کی کتب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب مستشرقین نے قرآن کو تاریخی و تنقیدی مطالعے کا موضوع بنایا تو ان علوم کے کئی مباحث ان کے اعتراضات کا نشانہ بنے۔ ان اعتراضات کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ طالب علم ان کا جواب محض انکار سے نہیں بلکہ متعلقہ علم کی بنیادوں کو سمجھ کر دے سکے۔ اس جواب میں پہلے اعتراضات کو بڑے عنوانات کے تحت منظم کیا جائے گا، پھر ہر عنوان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا اور ساتھ وہ اصول بھی بیان کیے جائیں گے جن پر مسلم اہلِ علم کا جواب قائم ہے۔ یہاں مقصد کسی بحث کو فیصلہ کن دینی حکم میں بدلنا نہیں بلکہ دو علمی روایتوں کے دلائل کا تعلیمی موازنہ ہے۔

اعتراضات کا اجمالی خاکہ

علوم القرآن پر اعتراضات کو پانچ بڑے دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دائرہ وحی اور مأخذ کا ہے جس میں بعض نے قرآن کے مضامین کو سابقہ مذاہب اور ماحول سے ماخوذ قرار دینے کی کوشش کی۔ دوسرا دائرہ جمع و تدوین کا ہے جس میں کہا گیا کہ متن کا موجودہ انتظام بعد کے ادوار کی کارروائی ہے اور ابتدائی صورت اس سے مختلف تھی۔ تیسرا دائرہ ترتیب و زمانی تقسیم کا ہے جس میں مکی و مدنی کی تقسیم اور سورتوں کی زمانی ترتیب کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی کوششیں ہوئیں، جن میں نولڈکے کی ترتیبِ نزول سے متعلق تحقیق مشہور ہے۔ چوتھا دائرہ غیر عربی الفاظ کا ہے جس میں جیفری وغیرہ نے بعض قرآنی الفاظ کو دیگر زبانوں سے ماخوذ قرار دیا اور اس سے دور رس نتائج نکالے۔ پانچواں دائرہ نسخ اور اسبابِ نزول کا ہے جہاں ان مباحث کو متن کی داخلی صورت حال پر اعتراض کی بنیاد بنایا گیا۔ ان پانچوں دائروں میں ایک مشترکہ اسلوب نظر آتا ہے: مسلم روایت کے بیان کردہ نظام کو پہلے سے مشکوک فرض کر کے متبادل مفروضہ قائم کرنا اور پھر اس مفروضے کو زیادہ معقول قرار دینا۔ تنقیدی جائزے کا پہلا کام اسی اسلوب کی نشاندہی ہے، کیونکہ جب فرضی بنیاد ہی کمزور ہو تو اس پر قائم نتیجہ بھی اسی درجے کا ہوتا ہے۔

جدول 1: علوم القرآن پر اعتراضات کے بڑے دائرے

متعلقہ علم	اعتراض کا محور	دائرہ
تاریخِ قرآن	مضامین کی ماخذیت کا دعویٰ	وحی و مأخذ
جمع القرآن	موجودہ انتظام کو متأخر قرار دینا	جمع و تدوین
مکی و مدنی، ترتیبِ نزول	مکی و مدنی اور زمانی ترتیب پر سوال	ترتیب و تقسیم
غریب القرآن، لغت	غیر عربی اصل کے الفاظ کا دعویٰ	الفاظ و لغت
ناسخ و منسوخ، اسبابِ نزول	نسخ اور اسبابِ نزول پر اعتراض	نسخ و اسباب

جمع و تدوین اور مکی و مدنی پر تنقیدی جائزہ

جمع و تدوین کے بارے میں مسلم روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی حیات میں لکھا جاتا رہا، کاتبینِ وحی موجود تھے، صحابہ نے اسے سینوں میں بھی محفوظ کیا، اور خلافتِ صدیقی میں اسے ایک مصحف میں جمع کیا گیا جبکہ عہدِ عثمانی میں اس کی معیاری اشاعت ہوئی اور نسخے مراکز کو بھیجے گئے۔ اعتراض کرنے والوں نے عام طور پر اس روایت کے بعض جزوی اختلافات کو اٹھا کر پورے نظام پر شبہ ڈالا۔ تنقیدی جائزے میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ جزوی روایتی اختلاف اور متن کی عدمِ حفاظت ایک چیز نہیں ہیں؛ مسلم علمی روایت نے ہر خبر کو سند کے ساتھ محفوظ کیا اور اسی شفافیت کی وجہ سے جزئیات ہمارے سامنے ہیں، جس نظام میں سب کچھ چھپا دیا جاتا اس میں سوال اٹھانے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ دوسرا نکتہ تواتر کا ہے: قرآن کی تلاوت نسل در نسل عملی طور پر جاری رہی اور یہ زبانی تواتر تحریری نسخوں کے ساتھ متوازی چلتا رہا، اس لیے متن کی حفاظت کا انحصار کسی ایک نسخے یا ایک روایت پر نہیں رہا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ قدیم مخطوطات کی دریافتوں نے بھی بنیادی متن کی یکسانی کی تائید کی ہے اور جہاں اختلافات پائے گئے وہ زیادہ تر رسم، اعراب یا قراءات کے اس دائرے میں رہے جسے مسلم علم خود بیان کرتا ہے۔ مکی و مدنی کے مبحث میں بھی صورت یہ ہے کہ یہ تقسیم مسلم علماء نے اسلوب، موضوع اور تاریخی اشارات کی بنیاد پر تدریجاً مدون کی اور اس میں اجتہادی پہلو موجود گی کو خود انہوں نے تسلیم کیا؛ کسی اجتہادی تقسیم کے بعض مقامات پر اختلاف کو پورے علم کی نفی کے مترادف قرار دینا علمی تناسب کے خلاف ہے۔ اسی طرح سورتوں کی زمانی ترتیب کے بارے میں نولڈکے کی کوشش ایک مفروضاتی تعمیر ہے جس کی بنیاد زیادہ تر داخلی اسلوبی قیاس پر ہے، جبکہ مسلم روایت اپنے بیانات کو نقل و سند سے جوڑتی ہے؛ دونوں کے درمیان فیصلے کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ کس دعوے کے پیچھے کس درجے کا ثبوت موجود ہے۔

الفاظ، نسخ اور اسبابِ نزول پر تنقیدی جائزہ

غیر عربی الفاظ کے مبحث میں جیفری کی کتاب The Foreign Vocabulary of the Quran (1938ء) نمایاں ہے جس میں کئی قرآنی الفاظ کو سریانی، عبرانی، حبشی یا فارسی الاصل بتایا گیا۔ اس پر تنقیدی جائزے کے بنیادی نکات یہ ہیں: اول، سامی زبانوں میں الفاظ کا اشتراک ایک لسانی حقیقت ہے اور مشترک مادے سے ہر لفظ کو مستعار ثابت نہیں کیا جا سکتا؛ دوم، مسلم لغویین نے اس مسئلے پر صدیوں پہلے بحث کی ہے اور معرب الفاظ کا تصور خود اسلامی لغت میں موجود ہے، اس لیے یہ کوئی نئی دریافت نہیں جس

سے دور رس نتائج نکالے جائیں؛ سوم، کسی لفظ کی لسانی تاریخ سے اس کتاب کے مأخذ کے بارے میں نتیجہ نکالنا منطقی مغالطہ ہے کیونکہ زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ لیتی رہتی ہیں۔ نسخ کے مبحث میں اعتراض عام طور پر اس تصور پر ہوتا ہے کہ بعد کی آیات کا بعض سابقہ احکام کو منسوخ کرنا متن کی ترتیب پر سوال اٹھاتا ہے۔ مسلم موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ نسخ حکمتِ تشریع کا حصہ ہے اور یہ تصور خود قرآن میں مذکور ہے، اور یہودیت و مسیحیت سمیت دیگر شرائع میں بھی تدریجی احکام کی مثالیں ملتی ہیں؛ ساتھ ہی مسلم علماء کے مابین منسوخ آیات کی تعداد میں اختلاف اور ان کی کمی کی طرف رجحان بھی خود اس علم کی داخلی تنقید کی مثال ہے۔ اسبابِ نزول پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ روایات واقعات کو بعد میں گھڑ کر آیات سے جوڑتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسبابِ نزول کی روایات بھی حدیث کے اصولوں سے گزرتی ہیں، محققین نے صحیح و ضعیف میں فرق کیا ہے اور مفسرین نے تنبیہ کی ہے کہ سبب خاص ہونے کے باوجود حکم اپنے عموم پر رہتا ہے۔ چنانچہ اس علم کی موجودگی کمزوری نہیں بلکہ فہمِ قرآن کی وہی تاریخی حساسیت ہے جس کا مطالبہ جدید تنقید خود کرتی ہے۔

جوابی اصول اور مجموعی جائزہ

ان تمام مباحث کا مجموعی جائزہ تین اصولوں پر قائم ہے۔ پہلا اصول یہ ہے کہ دعوے کا بوجھ دلیل پر ہوتا ہے: جو تاریخی مفروضہ مسلم روایت کے متبادل کے طور پر پیش کیا جائے اسے اسی درجے کے ثبوت سے ثابت کرنا ہوگا جس درجے کا ثبوت وہ روایت سے مانگتا ہے، اور قیاس و امکان کو ثبوت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرا اصول مأخذ کی درجہ بندی ہے: خبر کا درجہ اس کی سند، اس کے راویوں اور اس کی خارجی تائید سے بنتا ہے، اور کسی کمزور جز کو بنیاد بنا کر مضبوط کل کو گرانا درست نہیں۔ تیسرا اصول امتیازِ میدان ہے: لسانی اشتراک، تاریخی روایت اور عقیدے کے دعوے الگ الگ میدان ہیں اور ایک میدان کے نتائج کو دوسرے میں منتقل کرنے سے پہلے اضافی دلیل درکار ہوتی ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات نے مسلم اہلِ علم کو اپنے علوم کی نئی تدوین، مخطوطات کی تحقیق اور منظم جوابی ادب کی طرف ضرور متوجہ کیا، جو اس بحث کا ایک مثبت نتیجہ ہے، لیکن ان کے بڑے دعوے زیادہ تر اسی حد تک مضبوط ہیں جس حد تک ان کے مفروضات مضبوط ہیں۔ طالب علم کے لیے مناسب رویہ یہ ہے کہ وہ علوم القرآن کی کلاسیکی کتب سے ان علوم کی بنیادیں مضبوط کرے، اعتراض کو اس کے اصل الفاظ میں پڑھے، اور جواب میں وہی معیار اختیار کرے جس کا وہ خود پابند ہے۔ اس طرح تنقیدی جائزہ نہ دفاعی جذباتیات بنتا ہے اور نہ مرعوبیت، بلکہ ایک متوازن علمی مشق بن جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علوم القرآن پر مستشرقین کے اعتراضات وحی و مأخذ، جمع و تدوین، ترتیب و مکی و مدنی، غیر عربی الفاظ، اور نسخ و اسبابِ نزول کے دائروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تنقیدی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا مشترک اسلوب روایت کو پہلے سے مشکوک قرار دے کر مفروضاتی متبادل قائم کرنا ہے، جبکہ مسلم جواب تواتر، سند کی جانچ، مخطوطاتی تائید اور تشریح کی حکمت جیسے اصولوں پر قائم ہے۔ ساتھ ہی یہ بحث مسلمانوں کے لیے اپنے علمی ورثے کی تحقیق و تدوین کی تحریک بھی بنی ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس سوال کے جواب میں اعتراض اور جواب دونوں کو ان کے اصل متون میں رکھ کر پیش کرے اور نتیجہ استدلال سے نکالے، تاکہ اس کی تحریر ایک علمی تنقیدی جائزے کی حقیقی مثال بنے۔ یہی اسلوب اگلے سوال میں مصاحفِ صحابہ کے مبحث کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا، کیونکہ وہاں بھی بنیادی سوال مأخذ کے درجے اور دعوے کے تناسب ہی کا ہے۔

سوال نمبر 4 (25 نمبر)

سوال: صحابہ کرامؓ سے منسوب مصاحف کو مستشرقین نے کن مقاصد کے لیے استعمال کیا؟ (ایک مقالہ تحریر کیجئے)

تعارف: مقالے کا خاکہ

یہ مقالہ اس سوال کا جائزہ لیتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منسوب مصاحف یعنی ذاتی نسخوں کی اطلاعات کو مستشرقین نے کن مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ موضوع حساس بھی ہے اور علمی بھی، کیونکہ ایک طرف اس کا تعلق قرآن کے متن کی تاریخ سے ہے اور دوسری طرف اسی تاریخ کو بعض تحقیقات میں ایسے نتائج کی بنیاد بنایا گیا جن سے مسلم اہلِ علم نے اتفاق نہیں کیا۔ مقالے کی ترتیب یہ ہے: پہلے یہ واضح کیا جائے گا کہ صحابہ سے منسوب مصاحف سے مراد کیا ہے اور خود اسلامی مآخذ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؛ اس کے بعد مستشرقین کے استعمال کے بڑے مقاصد کو الگ الگ عنوانات میں بیان کیا جائے گا، جن میں آرتھر جیفری کی تحقیق کو نمائندہ مثال کے طور پر

سامنے رکھا جائے گا؛ پھر ان مقاصد کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا؛ اور آخر میں مقالے کا نتیجہ پیش کیا جائے گا۔ ابتدا ہی میں یہ اصول واضح کر دینا مناسب ہے کہ اسلامی مآخذ میں کسی صحابی کے ذاتی نسخے کی خبر کا موجود ہونا اور اس خبر سے کوئی خاص نظریہ اخذ کرنا دو الگ باتیں ہیں، اور اس مقالے کی پوری بحث اسی فرق پر قائم ہے۔

صحابہ سے منسوب مصاحف: اسلامی مآخذ کی بیان کردہ صورت

اسلامی تاریخ و علوم القرآن کی کتب میں یہ بات مذکور ہے کہ بعض صحابہ کرام نے اپنے ذاتی استعمال اور تعلیم کے لیے قرآن کے نسخے لکھ رکھے تھے جن میں سے بعض میں سورتوں کی ترتیب مختلف تھی، بعض میں توضیحی الفاظ حاشیے یا متن کے ساتھ لکھے ملتے ہیں اور بعض میں وہ قراءتیں شامل تھیں جو بعد میں منسوخ التلاوۃ قرار پائیں یا جن کا تعلق انفرادی روایت سے تھا۔ ان نسخوں کے بارے میں معروف مثالیں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے مصاحف کی ہیں جن کا ذکر المصاحف پر لکھی گئی قدیم کتب، خصوصاً ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف، میں تفصیل سے ملتا ہے۔ یہ نکتہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ اطلاعات خود مسلمانوں کی اپنی کتب میں محفوظ ہوئیں اور ان کی سندوں پر گفتگو بھی خود مسلم علماء نے کی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امت کو ایک معیاری رسم پر جمع کیا اور سرکاری نسخے مراکز کو بھیجے تو امت نے اس اجتماع کو قبول کیا اور ذاتی نسخوں کی حیثیت تعلیمی و انفرادی ہی رہی۔ مسلم علماء نے ان مختلف فی القراءۃ اطلاعات کو تین دائروں میں سمجھایا ہے: بعض توضیحی اضافے جو تفسیر کے طور پر لکھے گئے تھے، بعض وہ قراءتیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی، اور بعض وہ روایات جو سند کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس وضاحت کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ ذاتی مصاحف کی خبریں خود بخود معیاری متن سے اختلاف کی دلیل ہیں، مآخذ کی اس داخلی درجہ بندی کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے جسے سامنے رکھ کر ہی کوئی منصفانہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔

مقصد اول: متن کی یکسانی پر سوال اٹھانا

مستشرقین نے ان مصاحف کو سب سے پہلے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ قرآن کے متن کی ابتدائی یکسانی پر سوال کھڑا کیا جائے۔ استدلال کی صورت یہ بنائی گئی کہ اگر بڑے صحابہ کے نسخوں میں سورتوں کی ترتیب اور بعض الفاظ میں فرق تھا تو موجودہ مصحف کو ایک متفق علیہ اصل کی واحد صورت قرار دینا مشکل ہے۔ اس استدلال کی بنیاد میں

ایک چھپی ہوئی پیش بندی ہے کہ ذاتی نسخے اور سرکاری مصحف ایک ہی درجے کی چیزیں تھے، حالانکہ تاریخی بیان کے مطابق ذاتی نسخے تعلیم و یادداشت کے معاون تھے اور ان میں لکھنے والے کی اپنی توضیحات بھی شامل ہو سکتی تھیں۔ مزید یہ کہ ترتیبِ سورت کا اختلاف مسلمانوں کے ہاں کبھی متن کی صحت کا مسئلہ نہیں رہا، کیونکہ سورتوں کے اندرونی متن اور اس کی تلاوت کا تواتر اپنی جگہ قائم رہا۔ آرتھر جیفری نے اپنی کتاب Materials for the History of the Text of the Quran (1937ء) میں ان منسوب مصاحف کی روایات کو جمع کر کے انہیں متن کی تاریخ کے مادے کے طور پر پیش کیا۔ اس کتاب کی حیثیت ایک مآخذی مجموعے کی تو ہے اور اس سے روایات کی فہرست سازی میں مدد مل سکتی ہے، لیکن اس مواد سے یہ نتیجہ نکالنا کہ معیاری متن بعد کی چیز ہے، اس سے آگے کا قدم ہے جس کے لیے اضافی ثبوت درکار تھا۔ یہاں مقالے کا تنقیدی نکتہ یہی ہے کہ مواد جمع کرنا ایک کام ہے اور اس سے نظریہ اخذ کرنا دوسرا، اور دونوں کو الگ رکھے بغیر اس بحث کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

بدولہ: منسوب مصاحف کے بارے میں اطلاعات کی نوعیت

مسلم علماء کی توجیہ	مثال	نوعیت
ذاتی نسخے کی تعلیمی ترتیب؛ متن متاثر نہیں	سورتوں کی آگے پیچھے ترتیب	ترتیب میں فرق
تفسیر کے طور پر درج؛ متن کا حصہ نہیں	مشکل مقام کی شرح کے الفاظ	توضیحی الفاظ
منسوخ التلاوۃ یا انفرادی روایت	بعد میں غیر متداول قراءت	قدیم قراءتیں
اصولِ روایت کے مطابق ناقابلِ استناد	سنداً کمزور اطلاعات	غیر مصدقہ روایات

مقصد دوم اور سوم: تاریخی تعمیرِ نو اور تقابلی متن شناسی

دوسرا مقصد قرآن کے متن کی تاریخ کی تعمیرِ نو تھا۔ مغربی علمی روایت میں بائبل کے مطالعے سے پروان چڑھنے والے تنقیدِ متن (Textual Criticism) کے طریقے کو قرآن پر لاگو کرنے کی کوشش کی گئی، اور اس طریقے کے لیے مختلف قراءتوں اور منسوب مصاحف کی اطلاعات کو وہی کردار دیا گیا جو اس طریقے میں نسخوں کے اختلافات کو

حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کے پس منظر میں یہ مفروضہ کار فرما تھا کہ قرآن کی تاریخ بھی دوسری قدیم کتابوں کی طرح نسخوں کی بکھری ہوئی روایت سے گزری ہوگی۔ اس مفروضے کی کمزوری یہ ہے کہ قرآن کی روایت کی خصوصیت اس کا زبانی تواتر اور حفظ کی زندہ روایت ہے، جو اسے محض تحریری نسخوں کی تاریخ سے مختلف بنا دیتی ہے؛ کسی کتاب پر دوسری کتاب کا طریقہ بلا جائزہ لاگو کرنا قابلِ مطالبے کی بنیادی شرط، یعنی مشابہت کا ثبوت، پوری نہیں کرتا۔ تیسرا مقصد جمعِ عثمانی کے عمل کو ایک انتظامی فیصلے کے طور پر پیش کر کے اس کی دینی و اجتماعی حیثیت کو کم کرنا تھا، یعنی یہ کہنا کہ ایک قراءت کو سرکاری قرار دے کر باقی کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے جواب میں مسلم مؤرخین اور ماہرینِ علوم القرآن نے دکھایا ہے کہ عثمانی جمع کا پس منظر قراءت کے اختلاف سے پیدا ہونے والے عملی مسائل تھے، اس عمل میں کبار صحابہ کی شرکت اور امت کا قبول عام اسے محض انتظامی اقدام سے بڑھا کر اجتماعی اجماع بنا دیتا ہے، اور جن چیزوں کو چھوڑا گیا ان کی حیثیت خود روایات میں واضح ہے کہ وہ یا تو ضیح تھیں یا منسوخ التلاوۃ یا غیر مصدقہ۔ چنانچہ ان دونوں مقاصد کا حاصل بھی اسی اصول پر پرکھا جائے گا کہ جو مفروضہ پیش کیا گیا ہے کیا وہ اسلامی روایت کی اندرونی شہادت سے زیادہ مضبوط ثبوت رکھتا ہے یا نہیں، اور منصفانہ جائزے میں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

تنقیدی جائزہ اور مقالے کا نتیجہ

مجموعی تنقیدی جائزے کے چار نکات ہیں۔ اول، منسوب مصاحف کی خبریں دشمن مآخذ سے نہیں آئیں بلکہ خود اسلامی کتب میں سند کے ساتھ محفوظ ہیں، اور جس روایت نے اپنی مخالفِ ظاہر خبریں بھی اصولوں کے ساتھ محفوظ رکھی ہوں اس کی شفافیت اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کے حق میں جاتی ہے۔ دوم، ان خبروں کے بڑے حصے کی توجیہ خود مسلم علماء نے صدیوں پہلے کر دی تھی: توضیح، نسخِ تلاوت اور ضعفِ سند وہ تین دائرے ہیں جن میں یہ مواد سمٹ جاتا ہے، اور مستشرقین کے استعمال کی بنیادی خطا یہی ہے کہ انہوں نے اس توجیہ کو مطالعے کا حصہ بنائے بغیر مواد کو اپنے نظریے میں استعمال کیا۔ سوم، متن کا تواتر اور حفظ کی روایت وہ خارجی ثبوت ہے جسے نظر انداز کر کے محض نسخوں کی فہرست سے نتیجہ نکالنا نامکمل مطالعہ ہے۔ چہارم، جیفری جیسے محققین کے مآخذی کام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مواد اور نظریے کو الگ رکھا جائے، اور یہی اصول اس پورے کورس میں بار بار سامنے آتا ہے۔ نتیجتاً یہ مقالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صحابہ سے منسوب مصاحف کو مستشرقین نے بنیادی طور پر تین مقاصد کے لیے استعمال کیا: متن کی یکسانی پر سوال، متن کی تاریخ کی مفروضاتی تعمیرِ نو، اور جمعِ عثمانی کی حیثیت کو گھٹانا۔ ان تینوں مقاصد کی بنیاد میں مسلم مآخذ کی داخلی درجہ بندی کو نظر انداز کرنا اور ایک

خارجی طریقہ کار کو بلا ثبوت لاگو کرنا شامل ہے۔ طالب علم کے لیے اس مقالے کا سبق یہ ہے کہ وہ کسی بھی تاریخی دعوے کو اس کے مأخذ، اس مأخذ کے درجے اور اس سے نکالے گئے نتیجے کے تناسب کو الگ الگ پرکھ کر قبول یا رد کرے۔ یہی تنقیدی ترتیب اسے اگلی مشق میں قراءات اور سیرت کے مباحث میں بھی درست سمت دے گی، جہاں یہی سوالات نئی صورتوں میں دوبارہ سامنے آئیں گے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com